۲۲ رفروری ۱۹۷۱ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۳۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۸

اس شمارے میں

اداریہ

یاد رکھیے

(۱) ۱۹۷۱ء کی مردم شماری ۱۰ رمارچ ۱۹۷۱ء سے شروع ہوگی اور ۳۱ رمارچ ۱۹۷۱ء کو ختم ہوگی۔

(۲) بے گھر لوگوں کی مردم شماری ۳۱ رمارچ ۷۱ء کی رات میں ہوگی۔

(۳) پہلی اپریل ۱۹۷۱ء سے تیسری اپریل ۱۹۷۱ء تک نظرثانی کے لئے ایک دورہ ہوگا جس کا مقصد یہ ہوگا کہ پہلی اپریل کی صبح تک کے اعداد و شمار مکمل ہوجائیں۔

(۴) مکانوں پر نمبر ڈالے جاچکے ہیں اور کارکن انھیں مکانوں پر مردم شماری کرنے آئیں گے جن پر نمبر موجود ہیں، اس لئے اگر اب بھی کسی مکان پر نمبر نہیں پڑا ہے تو فوراً مقامی مردم شماری کے اسٹاف سے رجوع کرنا چاہیے۔

(۵) اپنی مادری زبان لکھوانے کے بعد دیکھ لیجیے کہ کارکن نے صحیح اندراج کیا ہے یا نہیں۔

(۶) مادری زبان کے علاوہ اگر آپ کوئی اور ہندوستانی زبان جانتے ہیں تو وہ دوسرے خانے میں درج کرائیے۔ مادری زبان کے خانے میں صرف مادری زبان درج کرائیے۔

(۷) جن لوگوں کی مادری زبان اردو نہیں ہے، مگر وہ اردو جانتے ہیں ان کو ترغیب دلائیے کہ وہ دوسری زبان کے خانے میں اردو کا اندراج کرائیں۔

(۸) مردم شماری کے کمشنر نے ۱۲ رجنوری کی پریس کانفرنس میں مادری زبان کے اندراج کے سلسلے میں واضح طور پر اپنی پالیسی بیان کی ہے۔ اس بیان کا ترجمہ ۱۵ رفروری کے ہماری زبان میں شائع ہوچکا ہے۔ سہولت کے لئے ہم یہ حصہ پھر درج کر رہے ہیں۔ یہ بیان اس بات کی ضمانت ہے کہ آپ کی زبان کے متعلق جو اندراج کیا گیا ہے آپ اسے دیکھ سکتے ہیں، یا آپ کے گھر کا کوئی بڑا دیکھ سکتا ہے اور سلپ کی پشت پر اپنے دستخط کرسکتا ہے مردم شماری کمشنر کی اس وضاحت کو سب تک پہنچانا اور اس سہولت سے سب کو آگاہ کرنا آپ کا فرض ہے تاکہ کوئی ناواقفیت میں غلط اندراج نہ کرادے یا غلط اندراج کی درستی نہ ہوسکے۔

مردم شماری کمشنر کی پریس کانفرنس کا فروری اقتباس:

"مردم شماری کی غرض سے، مادری زبان کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ یہ وہ زبان ہے جس میں کسی شخص کی ماں اس شخص کے بچپن میں اس سے گفتگو کرتی ہے اگر کسی کی ماں اس شخص

کی شیر خواری کے زمانے میں مر گئی ہے تو اس شخص کے بچپن میں اس کے گھر میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ اس کی مادری زبان ہے مردم شماری کے کارکنوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ مادری زبان کا پورا اندراج کریں خواہ مادری زبان کا کوئی بھی نام ہو اور کارکن کا کام یہ طے کرنا نہیں ہے کہ جو زبان بتائی گئی ہے وہ کسی بڑی زبان کی بولی ہے یا نہیں۔ اس سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ مادری زبان کے اندراج کے سلسلے میں وہ مذہب کا خیال نہ کرے، اس کا فرض یہ ہے کہ جو زبان، مادری زبان بتائی جائے اس کا اندراج کرے، وہ زبان بتانے والے سے کسی بحث میں نہ پڑے اور وہی زبان درج کرے جو بتانے والے نے بتائی ہے اس کے علاوہ کوئی اندراج نہ کرے۔ زبان درج کرانے والے کے اعتماد کے لئے مردم شماری کے کارکنوں سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ کسی گھر کے متعلق اندراجات گھر کے بڑے کو یا گھر کے کسی ذمہ دار فرد کو جس نے گھر والوں کی طرف سے جوابات دئے ہیں، دکھا دے اور مردم شماری سلپ کی پشت پر اس کے دستخط لے لے۔ مگر یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ چونکہ مردم شماری کا ریکارڈ بہ صیغۂ راز ہوتا ہے، اس لئے گھر کے فرد کے علاوہ کوئی اور شخص اسے نہیں دیکھ سکتا۔ مردم شماری کے کارکنوں پر یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ اگر کوئی غلط اندراج کرے یا جو معلومات جمع کی گئی ہیں انھیں کسی غیر متعلق شخص کو دکھائے تو مردم شماری کے قانون کے مطابق اسے سزا دی جائے گی۔"

۹) آپ اپنے حلقے میں لوگوں کو سمجھا دیں کہ مردم شماری کے کارکن آئیں تو سب کام چھوڑ کر تمام اندراجات کرائیں، یہ آپ کا قومی فریضہ ہے۔

۱۰) لوگوں کو یہ بھی بتائیں کہ اگر کسی کارکن سے غلطی ہو جائے یا وہ صحیح اندراج نہ کرے تو مردم شماری کے مقامی افسر تک شکایت پہنچائیں۔

کلام نرم نازک" شایع ہوگیا

ہند و پاک کے طنز و مزاح نگار شاعر رضا نقوی واہی کا چوتھا مجموعہ کلام "کلام نرم و نازک" کتابی شکل میں شایع ہوگیا ہے اس مجموعہ کو ادارہ نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ نے شایع کیا ہے۔ مجموعہ ۲۰۰ صفحات پر چھپا ہے اور قیمت ۴ روپیہ ہے۔

• مناظر عاشق ہرگانوی

"تذکرہ آزردہ" کی اشاعت

علمی مجلس کے ماہی رسالہ "تحریر" کے شمارہ (۱۴) میں مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی کے مؤلفہ تذکرہ شعرائے اردو کا متن مفصل مقدمہ و حواشی کے ساتھ شایع ہو گیا ہے اس تذکرہ کا وحید قلمی نسخہ کیمبرج میں محفوظ ہے جسے پروفیسر ڈاکٹر مختار الدین احمد (صدر شعبۂ عربی، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ) نے اپنے معروف تحقیقی انداز میں حسن و خوبی سے مرتب کیا ہے۔

"علمی مجلس" دلی کے پروگرام میں اسی طرح دوسرے اہم اور غیر مطبوعہ تذکروں کی اشاعت بھی شامل ہے یہ پانچواں تذکرہ ہے جو "تحریر" میں چھپا ہے۔ یہ تذکرہ علیحدہ کتابی صورت میں بھی "علمی مجلس" فراشخانہ دہلی یا مکتبہ جامعہ، اردو بازار، دہلی سے مل سکتا ہے۔

• نامہ نگار

ڈنڈا مرحوم کے کلام کی تلاش

مرور ڈنڈا میموریل سوسائٹی نے ڈنڈا مرحوم کے تمام دوست احباب سے خواہش کی ہے کہ ڈنڈا مرحوم کے کلام، فوٹو اور آٹوگراف اگر ان کے پاس ہوں تو وہ سوسائٹی کے دفتر پر روانہ کریں۔ ڈنڈا مرحوم پر لکھے ہوئے مضامین کی کتاب "اہلی بن" جس کی بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر کتابت روک دی گئی تھی اس کو اب جلد شائع کیا جائے گا۔ اس کتاب میں ڈنڈا مرحوم کے منتخبہ کلام کے علاوہ شاعری آرٹ اور حالات زندگی پر نامور ادیبوں نے مضامین لکھے ہیں اور توقع ہے کہ اپریل کے دوسرے ہفتہ تک بازار میں آجائے گی۔ نیز ڈنڈا کے ساتھی شعرا اور ادیبوں سے بھی خواہش کی جاتی ہے کہ وہ مضامین اور کلام روانہ کریں۔

پتہ:

(۲۴۸) نامپلی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

ابوسلمان شاہجہان پوری
سکریٹری آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ کراچی

مولانا ابوالکلام آزاد کی

پہلی غزل

سب سے پہلی غزل جو مولانا آزادؔ نے ایک صاحب مولوی عبدالواحد سہسرامی کو سنائی اور پھر ان کے ہمت دلانے پر اشاعت کے لئے بھی بھیجی تھی، وہ تھی جس کا مقطع ہے:

آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

یہ غزل ارمغان فرخ کی طرح میں تھی یہ گلدستہ بمبئی سے حکیم عبدالحمید فرخ نکالا کرتے تھے۔ کلکتہ میں بعض لوگ اس کی ماہوار طرحوں میں مشاعرہ کرنے لگے، ایک مرتبہ اس کی طرح تھی:

پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

مولاناؒ نے اس غزل کے گیارہ شعر کہے تھے لیکن یہ معلوم نہیں کہ یہ گیارہ چھپے تھے یا کم چھپے تھے۔ مولاناؒ لکھتے ہیں کہ:

"آج بھی چھتیس برس گزر چکے ہیں اپنی وہ خوشی پوری طرح محسوس کر رہا ہوں جو مجھے اس وقت محسوس ہوئی تھی جب "ارمغان فرخ" میں یہ غزل چھپ کر آئی تھی زندگی میں پہلی بار میں نے اپنا نام ایک رسالے میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔"

مولاناؒ کو اس غزل کے تین شعر یاد تھے۔ ایک مذکورہ بالا مقطع اور دو مندرجہ ذیل شعر ان میں ایک مطلع ہے:

نشتر بہ دل ہے آہ کسی سخت جان کی
نکلی صدا تو فصد کھلے گی زبان کی

گنبد ہے گردباد تو ہے شامیانہ گرد
شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی

اس غزل کا ایک شعر مولانا کی بہن کو یاد تھا جو انھوں نے خواجہ احمد فاروقی صاحب کو ایک انٹرویو میں سنایا تھا:

ہوں نرم دل کہ دوست کے مانند رو دیا
دشمن نے بھی جو اپنی مصیبت بیان کی

مولانا آزادؒ نے اپنی ابتدائی شاعری کا یہ تذکرہ مولانا غلام رسول مہر کے نام ۳؍دسمبر ۱۹۳۶ء کے خط میں کیا ہے اور اسے چھتیس برس پہلے کی بات بتایا ہے۔ گویا اس غزل کی تخلیق و اشاعت کا زمانہ سنہ ۱۹۰۰ء ہے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ شاعری کے اس شوق میں انھوں نے ایک گلدستہ "نیرنگ عالم" نامی کلکتہ سے نکالا تھا لیکن آٹھ ماہ سے زیادہ عرصے وہ اسے جاری نہ رکھ سکے۔ اس کے بند ہونے کی وجہ مولانا نے یہ بتائی ہے کہ ابتدا میں خیال تھا کہ اس کے شائع ہوتے ہی بہت سے لوگ خریدار بن جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا اور وہ گلدستہ بند ہوگیا۔ کچھ عرصے کے بعد مولانا نے "المصباح" کے نام سے ایک پرچہ نکالا، ان کے بیان کے مطابق یہ بھی تین چار مہینے سے زیادہ نہ چل سکا اور بند ہوگیا۔

ابھی تک چونکہ "ارمغان فرخ" کے پرچے کہیں دستیاب نہیں ہوئے ہیں اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ "ارمغان" کے کس شمارے میں مولانا کی یہ غزل شائع ہوئی تھی۔ میرے علم کے مطابق "نیرنگ عالم" اور "المصباح" کے پرچے بھی ابھی تک کسی کو دستیاب نہیں ہوئے ہیں اس لئے ان کا ٹھیک ٹھیک زمانہ اشاعت نہیں بتایا جا سکتا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو مولانا کی شاعری کی ابتدا کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم کی جا سکتی تھی لیکن مولانا کی ایک غزل "خدنگ نظر" لکھنؤ بابت ماہ جون ۱۸۹۹ء میں ملی ہے اور میرے علم کے مطابق مولانا کی یہ پہلی مطبوعہ غزل ہے جو اب تک دستیاب ہوئی ہے۔ یہ غزل تاریخی اہمیت کی حامل ہے اور اس سے مولانا کی شاعری کی ابتدا کے بارے میں اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ غزل "خدنگ نظر" کی اس طرح میں ہے:

تو نے آدھی بات کی میں نیم بسمل ہوگیا

اس طرح کا اعلان مارچ کے پرچے میں کیا گیا تھا اور ۱۵ مئی تک غزلیں طلب کی تھیں۔ پھر اپریل کے نمبر میں ۱۵ جون تک اس مدت میں توسیع کا اعلان کیا گیا۔ جون کے نمبر میں تمام غزلیں اس طرح میں ہیں آخر میں چند غزلیں طرح ماہ گذشتہ میں بھی ہیں۔ اس طرح میں مولانا کی غزل یہ ہے:

کیوں اسیر گیسوئے خمدار قاتل ہوگیا
ہائے کیا بیٹھے بٹھائے تجھ کو اے دل ہوگیا

کوئی نالاں، کوئی گریاں، کوئی بسمل ہوگیا
اس کے اٹھتے ہی دگرگوں رنگ محفل ہوگیا

تم نے مارا غیر کو اور رشک نے مارا مجھے
اس نے تن پر کھائیں تلواریں میں بسمل ہوگیا

اس نے تلواریں لگائیں ایسے کچھ انداز سے
دل کا ہر ارماں فدائے دست قاتل ہوگیا

انتظار اس گل کا اس درجہ کیا گلزار میں
نور آخر دیدۂ نرگس کا زائل ہوگیا

یہ بھی قیدی بن گیا آخر کمند زلف کا
اے اسیروں میں ترے آزادؔ شامل ہوگیا

(جلد ۳، نمبر ۸، ص ۱۷)

یہی وہ غزل ہے جو اپریل ۱۹۰۳ء کے "مخزن" لاہور میں شائع ہوئی۔ لیکن اس میں اس غزل کا تیسرا شعر نہیں ہے اور پانچویں نمبر پر یہ شعر ہے:

قیس مجنوں کا تصور بڑھ گیا جب نجد میں
ہر بگولا دشت کا لیلیٰ کا محمل ہو گیا

اس طرح دونوں اشاعتوں میں اگرچہ تعداد اشعار چھ ہے لیکن ایک شعر مختلف ہے "مخزن" میں مقطع کے مصرع اولیٰ میں "بن گیا" کی جگہ "ہو گیا" ہے۔ "خدنگ نظر" میں جو مولانا کی غزل چھپی ہے اس میں ان کا نام اس طرح چھپا ہے:

"آزاد جناب مولوی غلام محی الدین صاحب مہتمم گلدستہ "نیرنگ عالم" کلکتہ" اس میں مولانا کے نام کے ساتھ مہتمم گلدستہ "نیرنگ عالم" کے الفاظ نے یہ مسئلہ بھی صاف کر دیا کہ "نیرنگ عالم" کا زمانہ ۱۸۹۹ء ہے۔ اگرچہ اس کے اجراء و بندش کے مہینوں کا تعین اس سے بھی نہیں ہو پاتا لیکن سال اور اس کے چھپنے کے بارے میں کوئی شبہ نہیں یعنی وسط سال ۱۸۹۹ء میں "نیرنگ عالم" کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا کی شاعری کی ابتداء ۱۸۹۸ء میں ہوئی ہوگی۔ جب کہ ان کی عمر صرف دس سال کی تھی۔ چند ماہ کی مشق کے بعد انھوں نے وہ غزل کہی جو مولوی عبدالواحد سہسرامی کو شائی اور "ارمغان فرخ" میں چھپی تھی۔ میرا خیال ہے یہ اسی زمانہ کی بات ہے اس کے بعد کچھ کلام کی اشاعت، مشاعروں میں شرکت، لوگوں کی داد و تحسین نے انھیں گلدستہ "نیرنگ عالم" نکالنے کی ہمت دلائی اور یہ ٹھیک ۱۸۹۹ء کی بات ہے۔

"خدنگ نظر" میں مولانا کی یہ پہلی (اور شاید آخری بھی) غزل ہے البتہ مئی ۱۹۰۲ء سے جولائی ۱۹۰۳ء تک ان کے سات مضمون[1] چھپے ہیں۔ مارچ ۱۹۰۲ء میں مہتمم "خدنگ نظر" کی یہ عرض خاص بھی چھپی ہے کہ:

"ہم نے اپنی کوشش میں اپنے دلی دوست ابوالکلام مولوی محی الدین صاحب آزاد دہلوی کو شریک کر لیا ہے جن کے اکثر مضامین "خدنگ نظر" اور دوسرے معزز اردو جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آئندہ سے وہ خدنگ نظر کے حصہ مضامین کے لئے اسسٹنٹ ایڈیٹر کے فرائض انجام دیں گے جو انھوں نے بخوشی قبول فرمائے ہیں۔"

چنانچہ مئی اور جون ۱۹۰۲ء میں ان کے مضامین میں ان کے نام کے ساتھ اسسٹنٹ ایڈیٹر کے الفاظ بھی چھپے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد شاید مولانا اپنا رسالہ نکالنے کی فکر اور انتظام میں مصروف ہو گئے تھے۔ اس لئے "خدنگ نظر" سے ادارتی تعلق قائم نہیں رہ سکا۔ نومبر ۱۹۰۳ء سے مولانا نے کلکتہ سے "لسان الصدق" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جو اگرچہ جاری تو تقریباً ایک سال (جولائی ۱۹۰۴ء تک) رہ سکا لیکن اس کی شہرت بہت ہوئی اور اردو جرائد کی تاریخ میں اس کا ایک اہم مقام بن گیا۔

---

[1] مضامین یہ ہیں: "زمانہ قدیم میں کبوتروں کی ڈاک" مئی و جون ۱۹۰۲ء (دو قسطوں میں)۔ "پنکچویشن" اکتوبر (غالباً) میاد و سنین، جنوری۔ "آثار قدیم" فروری، "مینار خسرو" (سلسلہ آثار قدیمہ) مارچ۔ "افغانستان" اپریل۔ "ضو بخر مرئی" (ایک جرمن پروفیسر کی حیرت انگیز ایجاد) مئی و جولائی ۱۹۰۳ء (دو قسطوں میں)۔ "ہماری زبان" علی گڑھ یکم نومبر ۱۹۶۹ء مضمون "مولانا ابوالکلام آزاد اور "خدنگ نظر"" از جناب عبدالقوی دسنوی۔

زبیر شفائی

غزل

اب اور ہی اسلوب و علائم ہیں غزل کے
یہ لہر کہ باہر گئی دریا سے اچھل کے

تھا معرکۂ سخت بیاباں کا سفر بھی
سورج نے بھی دم توڑ دیا خون اگل کے

جائے گا کدھر؟ یہ جو دھڑکتا ہے بدن میں
اس بے در و دیوار کے زنداں سے نکل کے

اڑ جائیں گے اعضائے بدن نقش کی صورت
رکھنا مری چوکھٹ پہ ذرا پاؤں سنبھل کے

اس بزم سے آئے ہوئے اے لمحۂ شاداب
دو چار قدم دیکھ مرے ساتھ بھی چل کے

میں عکس ہوس دیکھ رہا تھا کہ جبیں سے
دامن پہ گرا قطرۂ سیال پھسل کے

پھر میرے تعاقب میں ہے رفتار لہو کی
پھر اس نے پکارا مجھے آواز بدل کے

دیں گے خبر قتل زبیر اہل جہاں کو
اخبار کے یہ حرف کسی روز پگھل کے

عبداللطیف اعظمی

اردو میں دانش وری کی روایت

ماضی اور حال

آپ معاف فرمائیں اگر میں کھلے دل کے ساتھ اس کا اعتراف کروں کہ "دانش وری" کے مفہوم کو میں پوری طرح سے نہیں سمجھ سکا ہوں۔ ابھی حال میں بعض اخبارات میں یہ بحث اٹھائی گئی تھی کہ مسلم دانش ور کون لوگ ہیں۔ پہلے کچھ سیکولر اور قوم پرور مسلمانوں کا مسلم لیگ کے خلاف ایک بیان نکلا تھا جس میں پروفیسر ریڈ اور ٹھکر کے علاوہ چند صحافت نگار بھی شامل تھے، اس بیان پر دستخط کرنے والوں کو بعض اردو اخبارات نے "مسلم دانش ور" لکھا تھا، اس بیان کی مخالفین نے منجملہ اور اعتراضات کے یہ اعتراض بھی کیا کہ صحافت نگاروں کا دانش وروں میں شمار نہیں ہوتا، مگر جب اس کے جواب میں ایک اور بیان شائع ہوا جس کا عنوان تھا کہ "حقیقی مسلم دانش وروں کا بیان" تو اس کے دستخط کرنے والوں میں طباعت و اشاعت کے مہتمم اور کاتب کے نام بھی شامل تھے اس سے خیال ہوا کہ "دانش وری" کا تعلق یا تو کسی مخصوص سیاسی خیال سے ہے یا اس کا کوئی واضح اور متعین مفہوم نہیں ہے، ہر شخص جو مطلب چاہے نکال سکتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ علمی مجلس کے اس سیمینار کے مباحث سے اس لفظ کا مطلب بالکل واضح ہو جائے گا مگر بدقسمتی کہ کل کی بحث و گفتگو سے بھی میری مشکل حل نہ ہو سکی۔ بااس خیال سے کہ اس سیمینار کی بدولت کوئی اور فائدہ ہو یا نہ ہو، کم از کم دانش ور یا دانش کا مطلب واضح ہو جائے تاکہ آئندہ کوئی یہ جرأت نہ کرے کہ کسی صحافت نگار کی دانش وری سے انکار کرکے کسی کاتب کو دانش وروں میں شامل کر دے، اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق دانش وری کی تعریف کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ اس سیمینار کے دانش وروں کی بحث و گفتگو کے ذریعہ اس کا مفہوم قطعی طور پر طے ہو جائے گا۔

میں نے اوپر جس اخباری بیان کا ذکر کیا ہے، وہاں انگریزی کے لفظ INTELLECTUAL کا ترجمہ دانش ور کیا گیا تھا اور میرا گمان ہے کہ اس سیمینار کا عنوان مقرر کرنے والے فاضل دانشور یا دانشوروں نے بھی INTELLECTUALISM کا ترجمہ دانش وری کیا ہے۔ اس لئے دانش وری کی کوئی تعریف کرنے سے قبل بہتر ہوگا اگر انگریزی کے اس لفظ کو پہلے سمجھ لیا جائے۔ مولوی عبدالحق مرحوم کی ڈکشنری میں INTELLECTUAL کے معنی دئے ہیں "ذی فہم، روشن خیال، دانا، ذی ہوش" اور INTELLECTUALISM کے معنی لکھے ہیں "عقلیت" "یہ نظریہ کہ علم بیشتر عقل کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے"۔ انگریزی کے ان دونوں لفظوں کے معانی کی روشنی میں ہم اس شخص کو دانش ور کہیں گے جو روشن خیال ہو، قدامت پرست اور تنگ نظر نہ ہو، جس کی رائیں اور خیالات عقلیت اور دانش مندی پر مبنی ہوں نہ کہ محض روایات اور آبا و اجداد کی پرستش پر گویا دانش ور وہ کہلائے گا جو ماضی کے تجربوں کی روشنی میں زمانے کی تبدیلیوں اور ترقیوں کا ساتھ دے سکے سماجی خرابیوں کے خلاف بے لاگ اور بے باک اظہار خیال کرے، زندگی کے جمود کو دور کرکے حرکت و بیداری پیدا کرے اور مذہبی مسائل میں عقل "ناقد" سے کام لے۔

اگر میری یہ تعریف غلط ہے تو براہ کرم آپ تصحیح فرما دیجئے، محدود ہے تو توسیع کر دیجئے اور اگر صحیح ہے تو اس کی روشنی میں اردو میں دانش وری کی واضح مثالیں سرسید سے شروع ہوتی ہیں۔ کل کے سیمینار میں سرسید سے پہلے کچھ علمائے کرام کی دانش وری کا ذکر آیا تھا مگر میں نے ان کا ذکر اس لئے نہیں کیا ہے کہ ہمارا موضوع بحث ہے "اردو میں دانشوری کی روایت" جس کا مطلب میں نے یہ لیا ہے کہ وہ دانش وری جس کا تحریر یا شاعری کے ذریعہ اظہار ہو۔ جہاد کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں، جہاد بالسیف، جہاد باللسان اور جہاد بالقلم۔ اگر جہاد کو یعنی جنگ آزادی کو دانش وری میں شامل کیا جائے گا، جیسا کہ کل ذکر کیا گیا، تو ہمارے موضوع بحث کے لحاظ سے اس میں جہاد بالقلم شامل ہوگا۔ اس لئے میرے محدود علم کے مطابق سرسید سے قبل اردو میں دانش وری کی اگر مثالیں ملیں گی تو شاذ و نادر اور ہمارے یہاں کہا جا سکتا ہے کہ دانش وری کا آغاز سرسید کے رفقاء میں جن کے یہاں نمایاں طور پر اور زندگی کے وسیع دائرے میں دانش وری کی روایات ملتی ہیں، وہ شبلی ہیں۔ شبلی سرسید کے تمام رفقاء میں جید عالم تھے، ان کا عربی، فارسی اور مذہبی مطالعہ بڑا وسیع تھا، ان کے رفقاء میں ایک بھی نہیں تھا جو دو سطریں عربی میں لکھ سکے اور شبلی نے جرجی زیدان جیسے شخص کا جس کی مادری زبان عربی تھی، اس زمانے کی اصطلاح میں دندان شکن جواب لکھا تھا۔ سرسید کی ملاقات یا علی گڑھ آنے سے قبل وہ کٹر مولوی تھے یا آج کل کی اصطلاح میں آرتھوڈکس مولوی تھے، مگر علی گڑھ کے قیام نے ان کے ذہن کو اس قدر متاثر کیا کہ اس دور میں ان سے زیادہ روشن خیال عالم دین جو مصنف اور ادیب بھی ہو، شاید ہی کوئی مل سکے۔ تحریک آزادی ہو یا عربی کا نصاب، تعلیم، تحقیق و تنقید ہو یا مذہبی اور سیرت نبوی کا کوئی موضوع، ہر جگہ وہ مفکر اور دانش ور کے روپ میں نظر آئیں گے۔ مولانا شبلی کے بعد علماء میں کوئی ممتاز دانش ور نظر آتا ہے تو مولانا آزاد ہیں، انھوں نے بھی اردو میں مختلف شعبہائے حیات میں دانشوری کی شاندار روایات چھوڑی ہیں۔ مفکر کے لحاظ سے مولانا مودودی کا مرتبہ بھی بہت اونچا ہے۔ مگر سوال یہاں دانش وری کا ہے جس کی ایک شرط میری تعریف کے مطابق

روشن خیالی بھی ہے، میں نے عرض کیا ہے کہ دانشور وہی ہو سکتا ہے جو زمانے کی تبدیلیوں کا ساتھ دے سکے، اپنی بصیرت کے مطابق وہ زمانے سے پیچھے نہ ہو آگے ہو، اور مولانا مودودی چودہ سو سال پیچھے لیجانا چاہتے ہیں، اس لئے میرے نقطۂ نظر کے مطابق ان کو دانشوروں کی صف میں بٹھانا ممکن نہیں ہے۔

مغربی تعلیم یافتہ طبقے کے بہت سے ادیبوں کا، عابد رضا بیدار صاحب نے "حرف آغاز میں" ذکر کیا ہے۔ مثلاً ذاکر صاحب، عابد صاحب، سیدین صاحب، مجیب صاحب کا۔ ان لوگوں کی مختلف تحریروں اور کتابوں میں بلاشبہ دانشوری کی بہت سی روایات ملتی ہیں، مگر یہ لوگ تعلیم کی خدمت میں اس قدر مشغول رہے کہ تصنیف و تالیف کی طرف پوری طرح توجہ نہ کر سکے۔ اس کے علاوہ جب کسی شخص کو کوئی ادارہ چلانا پڑتا ہے تو ایسے اختلافی امور سے بچنا پڑتا ہے، جن سے ادارہ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ بیدار صاحب نے حرف آغاز میں دانشوری کی مثالوں میں مجیب صاحب کی انگریزی کتاب "انڈین مسلمز" کا ذکر کیا ہے۔ مجیب صاحب نے اسے اردو میں صرف اسی لئے نہیں لکھا ہے کہ ایک خاص طبقہ پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ جائے گا، انھیں اپنی تو فکر نہیں ہے، مگر نہیں چاہتے کہ ان کے خیالات کی وجہ سے جامعہ کو نقصان پہنچے۔ انھوں نے ابھی حال میں ایک مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے "اسلام میں افراد کے ضمیر کا مقام" میرے خیال میں آزادی کے بعد اردو میں جس قدر لکھا گیا ہے، دانشوری کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔ اس میں ایک جگہ مجیب صاحب نے لکھا ہے کہ

"سید احمد خاں نے ایک تعلیمی ادارے کو
قائم کرنے کی خاطر مذہبی بحث سے توبہ کر لی۔"

اس مضمون کی وجہ سے مخصوص ذہنیت رکھنے والے علماء اور غیر علماء نے جس طرح ان کی مخالفت شروع کر دی ہے اس کی وجہ سے مجھے ڈر ہے کہ جامعہ کی خاطر مجیب صاحب بھی اس قسم کے مضامین لکھنے سے توبہ کر لیں گے، کم از کم اردو میں۔ کل کے سیمینار میں ذکر آیا تھا کہ حکومت کے جبر کی وجہ سے بہت سے دانشوروں کو اپنی بات کہنے کا موقع نہیں ملا، میرے خیال میں حکومت کا جبر دانشوروں کی راہ میں اتنی بڑی رکاوٹ ثابت نہیں ہوتا جتنا خود اس کی قوم کا جبر، ایسا جبر جس سے اس کی زندگی کو نہیں اس کے مقصد زندگی کو خطرہ لاحق ہو، مقصد کی خاطر آدمی بہت سے کڑوے گھونٹ پی لیتا ہے، کبھی کبھی زہر بھی۔

اس سیمینار کے مختلف دانشوروں نے کل کے افتتاحی اجلاس میں بالکل صحیح فرمایا تھا کہ اردو میں دانشوری کی مثالوں کی اس لیے بہت کمی محسوس ہوتی ہے کہ ہندوستان میں اردو ذریعہ تعلیم نہ ہو سکی اور شاید اسی وجہ سے اردو میں علمی کتابوں کی بڑی کمی ہے اور آزادی کے بعد اردو ایسے حالات سے دوچار ہوئی کہ معیاری رسالے اور اچھے ناشر ختم ہو گئے۔ بیدار صاحب نے حرف آغاز میں بہت سے ایسے مسائل کا ذکر کیا ہے، جن کو ہماری قومی زندگی میں بہت اہمیت حاصل ہے، مثلاً مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ، مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کا مسئلہ، قومی سیاست میں اخلاقی قدروں کی پامالی کا مسئلہ، یہ اور اسی طرح کے بہت سے مسائل ہیں، جن سے ہماری قومی زندگی دوچار ہے، مگر اردو کے کتنے ادیب اور دانشور ہیں جو ان کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں؟ یہ سچ ہے کہ اردو میں علمی رسالوں اور ایسے اداروں کی کمی ہے جو خالص علمی کتابوں کو شائع کرنے کے لئے آمادہ ہوں، مگر کم از کم دو رسالوں اور ایک ادارہ کا میں نام لے سکتا ہوں، ماہنامہ جامعہ اور سہ ماہی اسلام اور عصر جدید کا اور اداروں میں اسلام اینڈ ماڈرن ایج سوسائٹی کا۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ فکر انگیز مضامین لکھنے والوں کی اس قدر کمی ہے کہ ان دو رسالوں کا بھی پیٹ نہیں بھرتا۔ اگر ہمارے یہاں اہل فکر کا ایک طبقہ پیدا ہو جائے، چاہے وہ تعداد میں کتنا ہی کم ہو، تو وہ اپنی تخلیقات کی اشاعت کا بھی انتظام کرے گا، مگر اصل مسئلہ یہی ہے کہ علمی، قومی اور تہذیبی مسائل پر لکھنے والے جو تھوڑے بہت ہیں، وہ بوڑھے ہو چکے ہیں اور نوجوانوں میں یا تو ایسے اشخاص ہیں جن کو ان مسائل پر لکھنے کی صلاحیت یا تو بہت کم ہے یا ہے ہی نہیں یا وہ زندگی سے اس قدر بیزار اور مایوس ہیں کہ ان پر لکھنا بے سود سمجھتے ہیں۔ یہ سیمینار اگر دو چار لکھنے والوں کو بھی اس طرف متوجہ کر سکے تو اس کی کامیابی کے لئے اسی قدر بہت ہے۔ (دہلی کے اردو میں دانشوری کی روایت پر سمینار منعقدہ ۲۲،۲۳ جنوری ۱۹۷۰ میں پڑھا گیا)

سعدی یا کمال خجندی؟

نواب صدیق حسن خاں (بھوپال) کی تالیف "شمع انجمن" (مطبوعہ ۱۲۹۳ھ) میں فارسی شاعر کمال خجندی کے بارے میں لکھا ہے کہ حسن عذوبی کا پیرایہ اس حد تک کرتا تھا کہ اسے "دزد حسن" کہتے ہیں۔ خواجہ حافظ شیرازی سے اس کی خلوص کی بات اور عاشقانہ دوستی تھی۔ اسی تالیف میں کمال کے متعلق "بہارستان جامی" کے حوالے سے تحریر ہے کہ:

"صحبت کمال خجندی بہ از شعرش و شعر حافظ
شیرازی بہ از صحبتش بود"

حالانکہ "بہارستان" کے دوسرے نسخے میں (جو پیش نظر ہے) یہی بات حافظ و سعدی کی نسبت سے لکھی ہے۔ یعنی سعدی کی صحبت ان کے شعر سے بہتر اور حافظ کا شعر ان کی صحبت سے بہتر۔ یعنی سعدی کی باتوں کا اور وسیع معلومات کا لطف ان کے کلام سے بھی زیادہ تھا۔

سوال: اصل معاملہ کیا ہے؟ یہ بیان سعدی کے بارے میں ہے یا کمال خجندی کے بارے میں؟

ماسکو۔ • ظ انصاری

مخدوم قلی کے دیوان کی تلاش

مخدوم قلی ترکمانوں کا سب سے مقبول شاعر ہے جو ۱۸ویں صدی میں ہوا۔ ہندوستان اس کے خوابوں کا ملک تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ہندوستان آیا تھا اور بعضوں کا کہنا ہے کہ اس کے دو بھائی مخدوم قلی کا صرف کلام لے کر ہندوستان روانہ ہوئے۔

ان دونوں بھائیوں کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ ایران سے تو گزرے لیکن غالباً پنجاب میں مارے گئے کیوں کہ پنجاب (ابدالی کے آخری حملے (۱۷۶۱ء کے بعد) باہر سے آنے والوں کے لئے مخدوش ہو گیا تھا۔

ہندوستان کے کسی کتب خانے میں مخدوم قلی کا قلمی دیوان محفوظ ہے اور مصنف کا نام ذرا بگڑا ہوا ہے: مختوم قلی آج بھی ترکمانیہ میں "ق" کو "ک" اور "ت" کو "د" یا اس کے برعکس بولتے ہیں۔

سوال: کیا یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ مخدوم قلی کا دیوان یا منتشر کلام کہاں، کس خزانے یا کتب خانے میں محفوظ ہے؟

ماسکو۔ • ظ انصاری

دیوان غالب اور بجنوری

راقم الحروف کے مضمون "دیوان غالب، وید مقدس اور بجنوری" کے متعلق ہماری زبان مورخہ یکم فروری میں جناب مسعود احمد صاحب کا مراسلہ نظر سے گزرا۔ موصوف نے فرمائش کی ہے کہ نثر کی تقریظ دیوان غالب کا پہلا جملہ جو نقل ہوا ہے اس کا میں ترجمہ کر دوں۔ چونکہ میرے مضمون میں تقریظ کا پہلا جملہ بعد میں اور بعد کا ایک جملہ پہلے درج ہے اس لئے یہ واضح نہیں کہ ان کو کس جملے کے سمجھنے میں مشکل محسوس ہوتی ہے۔ بہر حال تقریظ کے پہلے جملے کا پہلا لفظ جس کے سمجھنے میں کچھ دشواری ہو سکتی ہے "بنامیزد" ہے۔ اس کے معنی ہیں بنام خدا۔ در اصل یہ لفظ "بنام ایزد" تھا۔ کثرت استعمال سے یہ صورت ہو گئی۔ کلمۂ تعجب اور قسم کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

تقریظ کا ایک جملہ جو میرے مضمون میں پہلے آیا ہے یہ ہے:

"ہاں وہاں ترسم کہ آنچہ مردم نہ سختہ باشی ہمانا منتخب دیوان اردو زبان است ....."

مضمون میں "نہ سختہ" کے بجائے "نسختہ" درج ہو گیا ہے۔ دیوان غالب کے بارے میں تعریفی کلمات لکھنے کے بعد تقریظ نگار قاری کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ہاں ہاں میں ڈرتا ہوں کہ میں نے جو نغمہ سرائی کی اس کو تو نے تولا نہیں ہو گا، یقیناً یہ اردو زبان کا منتخب دیوان ہے۔

"ریختۂ کلک میں" اور دوسرے توصیفی فقروں کو سمجھنے میں غالباً کوئی خاص دشواری نہ ہوگی۔

بھوپال۔ • ابو محمد سحر

اخبار و اذکار

اردو دانشوری پر دہلی میں دو روزہ

سیمینار کی مختصر روداد

۳۰ و ۳۱ جنوری کو حسب قرار داد علمی مجلس دہلی نے اردو دانشوری پر ایک دو روزہ سیمینار کیا۔ سیمینار کے جلسے غالب اکیڈمی، نظام الدین میں ہوئے۔ موضوع تھا "اردو میں دانشوری کی روایت، ماضی اور حال"۔ سردار جعفری صاحب نے سیمینار کا افتتاح کیا اور پہلے سیشن کی صدارت ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے کی۔ "حرفِ آغاز" کے طور سے عابد رضا بیدار نے مقالہ پڑھا۔ علی گڑھ کے مہمان ڈاکٹر وحید اختر صاحب نے "جدیدیت، ایک تہذیبی رویہ" کے عنوان سے اپنا متوازن مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا جب تک جدیدیت فیشن سے آگے بڑھ کے ایک ذہنی اور تہذیبی رویہ کی شکل اختیار نہیں کرتی اس کی دانشوری میں کلام کیا جاتا رہے گا۔ بیگم رضیہ سجاد ظہیر نے پریم چند کا مطالعہ پیش کیا کہ ان سے ہم دانشوری کے سلسلہ میں کیا سیکھ سکتے ہیں۔ عتیق صدیقی صاحب نے سرسید کی سیاسی دانشوری کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ ان سے ہم سمت مخالف میں کیا کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ شہاب انصاری نے آج کی اردو صحافت کو دانشوری کی میزان پر تولا۔ علی گڑھ کے ایک اور مہمان امیر عارفی صاحب نے نیاز فتحپوری کی بھولی بسری دانشوری یاد دلائی، جس پر پروفیسر عبد الخالق نقوی اور جناب علی جواد زیدی نے اور پھر جناب مالک رام نے اپنی ذاتی معلومات سے بھی مقالہ نگار کے اس نکتہ پر موافق و مخالف دونوں طرح بحث کی کہ نیاز کی کونسی تحریریں ان کی اپنی ہیں۔

دوسرے سیشن کی صدارت سید سجاد ظہیر صاحب نے کی۔ اس میں علی گڑھ کے ڈاکٹر اعجاز عسکری کا مقالہ، وہ خود آ نہیں سکے اس لئے، پڑھا گیا/ مان لیا گیا۔ یہ جدیدیت کے فیشن اور فارمولے والے پہلو پر ایک تنقید تھی جو انگریزی میں لکھی گئی تھی۔ جناب نثار احمد فاروقی نے براہ راست موضوع ہی کو اپنا عنوان بنایا اور بتایا کہ اردو میں دانشوری کی روایت اقلیدس کا فرضی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر۔ اس کی وجہ انھوں نے اس امر کو قرار دیا کہ ہمارے یہاں رائے کے اظہار کی آزادی علماء کی وجہ سے بہت کم ہے جہاں راستے سے ذرا کوئی ہٹا اور لوگ بلا پڑھے یا بلا سنے تنقید کرنے لگتے ہیں۔ دانشوری ہی کے موضوع پر ایک مقالہ جناب عبد اللطیف اعظمی نے بھی لکھا تھا جس میں انھوں نے دانشوری کی تعریف بھی کی اور ان دانشوروں کا ذکر بھی کیا جو ان کی اس تعریف میں آسکتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس کے لئے ایک بنیادی شرط روشن خیال ہونا ضروری قرار پائی اور اس لئے مولانا آزاد تو دانشور رہے لیکن مولانا مودودی نہیں۔

تیسرے سیشن کی صدارت ڈاکٹر سید وحید الدین صدر شعبہ فلسفہ دہلی یونیورسٹی نے کی۔ لکھنے والے دانشوری کو براہ راست بھی برت سکتے ہیں اور جیسا کہ ادب میں برتی جاتی ہے بالواسطہ بھی۔ براہ راست برتنے کے سلسلے میں اپنے حرفِ آغاز میں عابد رضا بیدار نے اردو کا مسئلہ اور علی گڑھ کا مسئلہ لے کر اپنی بات واضح کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب یہ تیسرا سیشن تو پورا کا پورا گویا مثال کے طور پر ہی کیا گیا تھا جس میں جناب دانیال لطیفی نے لسانی مسئلہ چھیڑا اور ہندوستان کی تمام زبانوں کے لئے نہ صرف ہندوستان کی یکجہتی کی خاطر بلکہ نئی سائنس اور ٹکنالوجی کے تقاضوں کے تحت رومن رسم الخط اپنانے کے سلسلہ میں تفصیلی مقالہ پڑھا۔ جناب سید سفارش حسین رضوی نے تہذیبی مسئلہ پر بات کی اور پلاسی سے تقسیم بنگال تک کے عہد کو اپنے مقالہ کا موضوع بنایا۔ جناب ظفر نظامی نے جن کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کا موضوع نیشنلسٹ مسلمان ہے سیاسی مسئلہ پر قلم اٹھایا تھا۔ افسوس ہے کہ تعلیمی مسئلہ پر جناب سید اسد اللہ کاظمی کو نہیں سنا جا سکا اور نہ وقت کی کمی کے سبب "مذہب پل صراط پر" کے موضوع پر جناب مالک رام کے خیالات سے مستفید ہوا جا سکا۔ کچھ اور مقالے بھی نہ ہو سکے جن میں جناب علی اشرف کا مقالہ مرید پر اور جناب ذکا صدیقی کا مقالہ سب رس سے فلمی رنگ تک قابل ذکر ہیں۔ مقالہ نگاروں کے علاوہ بحث میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر وحید الدین، جناب سجاد ظہیر، جناب علی جواد زیدی، جناب انور علی خاں سوز، جناب عنوان چشتی، جناب تنویر علوی، جناب خلیق انجم، جناب صدیق الرحمٰن قدوائی، جناب ضیاء الحسن فاروقی، جناب چندن، جناب حسن ثانی نظامی، جناب عبد الخالق نقوی، جناب ہنس راج رہبر، ڈاکٹر محمد شفیع رگرانی، جناب عارف رضوی، جناب علی سردار جعفری، ڈاکٹر ظہیر مسعود قریشی، جناب حسن نعیم، ڈاکٹر مشیر الحسن، جناب رئیس مرزا، جناب عبد اللطیف اعظمی نے حصہ لیا۔ جناب محمد حسن، جناب آل احمد سرور، جناب اعجاز عسکری، جناب ظہیر احمد صدیقی، جناب ابن فرید، جناب ابو الحسن ندوی، جناب عبد الماجد دریابادی، جناب انور صدیقی، جناب وفا صدیقی، جناب احتشام حسین، جناب عابد حسین اور بیگم صالحہ عابد حسین نے معذرت کے خطوط لکھے ہیں کہ چند در چند وجوہ سے وہ اس سیمینار میں شرکت نہ کر سکے۔ مرزا محمود بیگ صاحب پر اسی زمانے میں دل کا دورہ پڑا، شکر ہے کہ اب اچھے ہیں۔ جناب عالم خوند میری بھی نہ آ سکے۔

طے ہوا ہے کہ اس سیمینار کی مکمل روداد مرتب کی جائے لیکن اس سے پہلے یہاں جو خاص موضوع سے متعلق مقالے آئے اور جو صرف تین تھے انھیں تین جگہوں پر صرف بحث کے لئے پیش کیا جائے تاکہ اصل موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہو جائے، پہلے جامعہ میں پھر دہلی یونیورسٹی میں اور پھر علی گڑھ میں۔

(نامہ نگار)

دہلی یونی ورسٹی میں اردو رسم خط پر سیمینار

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام "اردو رسم خط" پر ایک دو روزہ سیمینار ۲۹، ۳۰ر جنوری ۱۹۷۰ کو ٹیگور ہال (دہلی یونی ورسٹی) میں منعقد ہوا۔ پہلا جلسہ ۱۱ بجے شروع ہوا۔

خطبۂ استقبالیہ میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے اس بات پر زور دیا کہ اردو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی آئینہ دار ہے، اس کا رسم خط اگرچہ عربی، فارسی سے مستعار ہے لیکن اس کا ہندوستان میں جس طرح ارتقا ہوا اس کی اپنی تاریخ ہے۔ آج یہ رسم خط اردو زبان کے تصور کا جزو لاینفک ہے، اس میں اصلاح و ترمیم کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن زبان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچائے بغیر ہم اس میں تبدیلی کا تصور نہیں کر سکتے سیمینار کے افتتاح کے لئے پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب تشریف لانے والے تھے، لیکن علالت کے باعث معذور رہے، خطبۂ افتتاحیہ ارسال فرمایا، ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے یہ خطبہ پڑھا۔ رشید صاحب نے زبان، تہذیب اور رسم خط کے باہمی تعلق پر زور دیا اور کہا جو لوگ اردو رسم خط کو بدل دینے کی بات کرتے ہیں انھوں نے زبان کو سمجھا ہے اور نہ رسم خط کے مسئلہ کو اس رسم خط کی خوبیوں اور فوائد پر آپ نے تفصیل سے روشنی ڈالی اس طرف بھی اشارہ کیا کہ رسم خط کی تبدیلی ایسے مسائل کا حل نہیں ہو سکتی جن سے آج اردو دوچار ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب بھی اپنی علالت کے باعث شرکت نہ کر سکے۔ اس لئے جلسہ کی صدارت جناب حیات اللہ انصاری صاحب نے فرمائی۔ خطبۂ صدارت میں آپ نے اردو کے لئے دیوناگری رسم خط اختیار کرنے کی مخالفت کی اس بات کی صراحت فرمائی کہ اردو رسم خط میں نہ صرف اردو کی بلکہ دیگر زبانوں کی آوازوں کو ظاہر کرنے کی جو صلاحیت ہے کسی دوسرے رسم خط میں نہیں۔ کشمیری زبان کی بعض مخصوص آوازوں کو بھی ہم اس رسم خط سے بخوبی ظاہر کر سکتے ہیں۔ مصوتوں کی جتنی مختلف شکلیں اس رسم خط سے ادا کی جا سکتی ہیں کسی دوسرے رسم خط سے ممکن نہیں۔ لیتھو چھپائی کی وجہ سے طباعت میں ہم پیش رفت نہیں کر سکے، لیکن یہ رسم خط کا قصور نہیں، اگر توجہ کی جائے تو لیتھو کو بہتر بنایا اور زیادہ تعداد میں چھپائی کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا اجلاس ۳ بجے شروع ہوا، پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے صدارت فرمائی۔ خطبۂ صدارت میں آپ نے اس بات پر زور دیا کہ اردو ایک مستقل زبان ہے، اس کا اپنا رسم خط ہے۔ اس کے لئے رومن یا دیوناگری کو اختیار کر لینا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہو سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ اس بات میں تو کوئی حرج نہیں کہ غیر اردو داں لوگوں کے لئے اردو ادب کے اعلیٰ نمونے دیوناگری رسم خط میں بھی شائع کئے جائیں لیکن اردو کے کل سرمایہ کو دیوناگری یا کسی دوسرے اہم خط میں منتقل کرنا نہ مناسب ہے نہ ممکن۔ اس طرح کی تبدیلی سے اردو کی حیثیت ختم ہو جائے گی۔ البتہ موجودہ رسم خط میں جو بعض خامیاں محسوس ہوتی ہیں ان کو دور کرنے کے لئے برابر غور و خوض ہوتا رہا ہے، بعض ترمیمات کو قبول کر لیا گیا ہے، بعض اب بھی زیرِ غور ہیں۔ آپ نے رائے بھی ظاہر کی کہ نستعلیق کے بجائے نسخ کے استعمال کو رواج دیا جائے جس سے ایک طرف ٹائپ کی سہولتوں سے فائدہ اٹھایا جا سکے اور دوسری طرف حروف کی کرسی کے مسائل سے بھی عہدہ برآ ہوا جا سکے۔

رشید حسن خاں صاحب (دہلی یونیورسٹی) نے "اردو املا کے مسائل" پر اپنا مقالہ پڑھا۔ آپ نے فرمایا کہ اکثر املا اور رسم خط کے مباحث کو گڈمڈ کر دیا جاتا ہے آپ نے اصطلاحوں کی واضح تعریف متعین کرنے پر زور دیا اور بعض اصطلاحوں کی تعریف پیش کی۔

ابو الفیض صاحب (ریسرچ آفیسر پبلک سروس کمیشن) نے اپنے مقالہ میں اردو رسم خط کی تاریخ پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ اس رسم خط کا تعلق عہدِ قدیم کے ہندوستانی کھروشتی رسم خط سے ہے مگر تاریخ کے دھندلکے میں بعض کڑیاں ابھی نہیں ملائی جا سکی ہیں، اس لئے اس رسم خط کو عربی سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔

عتیق احمد صدیقی صاحب (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے "زبان اور رسم خط کا تعلق" کے موضوع پر اپنے مقالہ میں کہا کہ زبان خود اختیاری اصوات کا مجموعہ ہے اور رسم خط خود اختیاری علامات کا، لیکن جس طرح ایک بار اختیار ہو جانے کے بعد زبان کی اصوات میں تبدیلی ممکن نہیں رہتی، اسی طرح کسی زبان کے لئے جو رسم خط اختیار کر لیا جاتا ہے وہ اس کا جزو لازم بن جاتا ہے اور بالآخر زبان اور رسم خط کو جدا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبد الحق صاحب (دہلی یونی ورسٹی) نے اردو رسم خط کے عہد بہ عہد ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ اس کے ارتقاء میں عرب و فارس کے بہترین ذہنوں نے حصہ لیا اور ہندوستان کے بہترین دماغوں نے اس کی ترتیب کی اردو زبان نے فارسی کی آوازوں کے ساتھ ہندوستانی ضروریات کے مطابق بعض آوازوں کا اضافہ کیا، اس کے رسم خط نے بھی نئی علامات اختیار کیں آج اس رسم خط کو محض عربی یا فارسی نہیں کہا جا سکتا۔

سیمینار کی تیسری نشست جناب سردار جعفری صاحب کی صدارت میں ۳۰ر جنوری کو ۱۰ بجے شروع ہوئی سردار صاحب نے فرمایا کہ ایک زمانے میں حالات کے پیشِ نظر اردو کے لئے

خود میں نے دیوناگری رسم خط کی حمایت کی تھی، لیکن آج کے مخصوص حالات میں اس خیال کی تائید نہیں کی جا سکتی۔ اب ہمیں اردو رسم خط کو ہی برقرار رکھنا ہوگا۔

ڈاکٹر ظہیر صدیقی صاحب (دہلی یونی ورسٹی) نے "رسم خط اور تہذیب کا تعلق" کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ آپ نے فرمایا کہ تہذیبوں کی نشو و نما کے ساتھ زبان اور اس کے رسم خط کا ارتقا ہوتا ہے اور پھر یہ تینوں لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔ اردو رسم خط کو ترک کرنے کا نقصان پورے ملک کا نقصان ہے خاص طور پر مسلمانان ہند کا کہ ان کا پورا مذہبی اور تہذیبی سرمایہ اسی رسم خط میں محفوظ ہے۔ اس عظیم سرمایہ کے نقصان کی تلافی ممکن نہیں۔ دیوناگری رسم خط اختیار کر لینے سے سہولتیں پیدا ہو جانا مشتبہ ہے لیکن اردو کا وجود خطرہ میں پڑ جانا یقینی۔

ڈاکٹر محمد حسن صاحب (دہلی یونی ورسٹی) نے اس سوال سے اپنا مقالہ شروع کیا کہ "کوئی زبان کوئی رسم خط کیوں اختیار کرتی ہے؟" آپ نے فرمایا کہ مخصوص تہذیبی، سماجی اور سیاسی حالات ہی دراصل اس کے محرک ہوتے ہیں۔ اردو کے آغاز کے وقت فارسی کو تہذیبی برتری حاصل تھی، اس کا رسم خط سارے ہندوستان میں رائج تھا بعض دیگر زبانوں نے بھی اس کا استعمال کیا لیکن اردو کو یہ ایسا راس آیا کہ یہ اس کا اپنا رسم خط ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کہ بعض دیگر زبانوں میں رسم خط کی تبدیلی کی مثال دی جاتی ہے لیکن ہمیں اردو اور ہندی کے قریبی رشتہ اور یہاں کے موجودہ سیاسی و سماجی حالات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اردو رسم خط کو ترک کر کے دیوناگری اختیار کر لینا اردو کے لئے مہلک ہوگا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب (دہلی یونیورسٹی) نے اردو رسم خط کے سماجی اور صوتی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ رسم خط بدل دینے کی رائے دینے والوں میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کی نیتیں صاف نہیں ہیں، کچھ لوگ محض معصومیت کا شکار ہیں۔ اردو رسم خط میں کچھ خامیاں ہو سکتی ہیں لیکن ان کا تدارک رسم خط کو ترک کر کے نہیں بلکہ اس میں ضروری اصلاح سے کیا جا سکتا ہے۔ مصوتوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اردو میں صحیح معنی میں صرف "ا" "ی" ایک مصوتہ ہے۔ آپ نے ہمزہ کے صحیح استعمال اور ہر لفظ کو متصل لکھنے پر زور دیا۔ اردو سے ہم صورت حروف کو خارج کر دینے کی بھی مخالفت کی۔ آخر میں سردار جعفری صاحب نے فرمایا کہ اردو ادب کے اچھے نمونے ساتھ ساتھ دیوناگری اور اردو رسم خط میں چھاپے جائیں اس سے بیگانگی اور تعصب کے دور ہونے میں مدد ملے گی۔ ان مقالات پر کچھ دیر مباحثہ ہوا۔ اور پھر محمد حسن صاحب نے شعبۂ اردو کی طرف سے شرکاء و حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور سیمینار اختتام پذیر ہوا۔ (نامہ نگار)

نظام الدین دہلی میں ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کا قیام

یہاں بستی حضرت نظام الدین اولیاء نئی دہلی میں ہندی کے ساتھ اردو تعلیم کے انتظامات، عام صحت، صفائی اور سماجی بھلائی کے کام کرنے کی غرض سے حضرت نظام الدین اولیاء ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔

اس سوسائٹی کا ایک افتتاحی جلسہ مقبول بلڈنگ میں زیر صدارت جناب خواجہ حسن ثانی۔ صدر سوسائٹی منعقد کیا گیا تھا جناب آر۔ جی۔ مہرا بہ حیثیت مہمان خصوصی مدعو تھے۔ ابتدا میں سوسائٹی کے بانی اور معتمد عمومی جناب ابو الفیض سحر نے اپنی مختصر سی تعارفی تقریر میں سوسائٹی کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اس خصوصی جلسے میں سوسائٹی کا افتتاح فرماتے ہوئے سوسائٹی کے اغراض و مقاصد سے اتفاق کیا اور اس قسم کی سرگرمیوں اور خاص کر ہندی کے ساتھ اردو ذریعہ تعلیم کے انتظامات کی کوششوں کی ضرورت پر زور دیا۔ • معتمد عمومی

اردو اکیڈمی نانڈیڑ اور مردم شماری

نانڈیڑ: اردو اکیڈمی نانڈیڑ کے ترجمان محمد بہاء الدین احمد نے اپنے ایک صحافتی بیان میں اردو داں احباب سے اپیل کی کہ آئندہ شروع ہونے والی مردم شماری میں اپنی مادری زبان اردو ہی لکھوائیں۔ ایسی ادبی انجمنیں جو اردو کے تحفظ و بقاء کے لئے کوشاں ہیں متحدہ و متفقہ طور پر ارد کارکن دیہاتوں میں روانہ کریں اس لئے صرف اپیل شائع کرنے سے دیہاتوں اور گاؤں کے ناخواندہ افراد کو کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچے گا۔ گاؤں گاؤں جا کر اندراجات صحیح طور پر کروانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ شمار کار کے اندراجات سے تشفی حاصل کرنے کے لئے سربراہ خاندان اندراجات کو دیکھ سکتا ہے۔ غلط اندراجات ہوں تو تصحیح بھی کرائی جا سکتی ہے۔

صفحہ ۱۲ سے آگے

ہے کہ جس طرح نسخۂ عرشی زادہ کے ترقیمے میں دن اور مہینہ موجود ہے اور سال غایب اسی طرح گل رعنا کے اس نسخے میں بھی دن اور مہینہ درج ہے اور سال غایب ہے۔ آخر دونوں نسخوں کے کاتب سال لکھنا کیوں بھول جاتے تھے۔ نسخۂ عرشی زادہ کو بخط غالب کہا گیا ہے اگر اس نسخے سے گل رعنا کا انتخاب ہوتا تو شاید یہ تاویل ہو سکتی کہ چونکہ غالب نے سال نہیں لکھا تھا اس لئے اس کی نقل میں کاتب نے بھی نہ لکھا۔ مگر یہ نسخہ تو غالب کی بیاض سے نقل کیا گیا ہے، اس میں سال کیوں درج نہیں، بہرحال یہ مسئلہ میرے نزدیک مزید تحقیق کا محتاج ہے خود مالک رام صاحب بھی اس معاملے میں کوئی قطعی بات نہیں کہہ سکے۔ مگر دو نسخوں میں سال کا نہ ہونا اندیشہ ہائے دور دراز ضرور پیدا کرتا ہے۔ مالک رام صاحب کا یہ کہنا کہ

"سال تحریر کی عدم تکمیل غالباً نتیجہ ہے کاتب کے سال ہجری سے ناواقفیت کا"

میرے نزدیک ماننے کے قابل نہیں، اس زمانے میں جب عام طور پر ہجری سنین ہی رائج تھے، کیسا ہی کاتب ہو ہجری سنین سے ضرور واقف ہوگا۔

مالک رام صاحب کا یہ خیال صحیح ہے کہ غالب کے یہاں شروع ہی سے سادہ اشعار بھی ملتے ہیں، مگر مجھے یہ اصرار ہے کہ یہ محض سادہ نہیں پرکار بھی ہیں "پرکاری" غالب کی فطرت ہے اس پرکاری کا اظہار سادگی میں بھی ہوتا ہے اور رنگینی میں بھی، دراصل ان کا قول "آئینہ زدودن اور صورت معنی نمودن" اس سلسلے میں ہماری زیادہ مدد کرتا ہے۔ اس سادگی اور میر کی سادگی میں بڑا فرق ہے، میر کے جذبے کی آنچ نے روشنی پیدا کر دی ہے، غالب کے یہاں فکر کی گرمی روشنی بن گئی ہے۔ میر کے یہاں خون جگر ہے، غالب کے یہاں ذوق نظر اور نشاط فکر۔

گل رعنا پر جو حواشی ہیں وہ مالک رام صاحب کی گہری تحقیقی نظر کا ثبوت ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت سے غالبیات میں نہایت اہم اضافہ ہوا ہے، اب شاید غالب کے فکر و فن پر اور گہری نظر ہو سکے اور ہمارے سامنے اس کی عظمت کے اور پہلو آ سکیں، یہ دلچسپ بات ہے کہ غالب پر جتنی روشنی پڑتی ہے اتنا ہی وہ پراسرار ہوتا جاتا ہے اور اسی نسبت سے ارباب نظر کے لئے ایک چیلنج بھی، اسے کسی نظریے، کسی فارمولے کسی ذہنی زاویے میں اسیر کرنا فضول ہوگا۔ وہ زندگی کی طرح ستون ہا - خیال کی طرح بلند اور کسی بت کافر کی طرح ہزار شیوہ ہے۔ اور ابھی ہم اس کے سمندر سے چند موتی ہی نکال سکے ہیں۔

ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا

آل احمد سرور

میرا صفحہ

غالبیات میں جناب مالک رام کی شہرت اظہر من الشمس ہے۔ ہندوستان میں انھوں نے اور امتیاز علی عرشی نے اور پاکستان میں شیخ محمد اکرام اور غلام رسول مہر نے اس سلسلے میں جو کچھ کیا ہے اس کی اہمیت سے اردو ادب پر تھوڑی سی بھی نظر رکھنے والا بھی انکار نہیں کر سکتا۔ حال میں مالک رام صاحب کا ایک اور کارنامہ منظر عام پر آیا ہے۔ یہ ہے وہ انتخاب جو گل رعنا کے نام سے کلکتے کے قیام کے دوران غالب نے اپنے اردو اور فارسی کلام کا کیا تھا۔ مولانا حسرت کو اس کے کچھ اوراق کسی طرح مل گئے تھے۔ چند سال ہوئے جناب نقی بلگرامی کی عنایت سے مالک رام صاحب کو اس کا وہ نسخہ ملا جو مولوی سید کرم حسین بلگرامی نے اغلباً غالب کے اپنے نسخے سے نقل کرایا تھا۔ اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے بعد لاہور میں غالب کا اپنا لکھا ہوا گل رعنا کا نسخہ بھی مل گیا جس کے مطبوعہ متن سے مالک رام صاحب نے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔

گل رعنا کی اشاعت ایک کارنامہ ہے۔ غالب نے اس میں اپنے اردو کلام کا جو انتخاب کیا ہے وہ کئی حیثیتوں سے غالب کو سمجھنے اور ان کے فکر و فن کا عرفان حاصل کرنے کے لئے اہم ہے۔ غالب نے ۱۸۲۸ء میں گل رعنا کی تکمیل کی۔ اس وقت ان کی عمر میں انتیس سال کی تھی۔ اردو میں وہ بہت کچھ کہہ چکے تھے، مگر فارسی پر اس وقت تک زیادہ توجہ نہ تھی۔ اس وجہ سے گل رعنا میں فارسی شعر تو اردو اشعار کے برابر ہیں، مگر نمایاں فرق یہ ہے کہ اردو اشعار ۱۱۶ غزلوں سے لئے گئے ہیں اور فارسی اشعار ۲۷ غزلوں سے۔ فارسی میں ایک قصیدہ، دو قطعے اور ایک مثنوی چراغ دیر بھی شامل ہے۔ مالک رام صاحب نے اپنے مقدمے میں آزاد نے اس روایت کی تکذیب کی ہے کہ غالب کا وہ دیوان "جو کہ آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں"

... حالی اور مرزا فانی کے حسن انتخاب کا نمونہ ہے۔ ویسے یہ ... سے پہلے بھی ظاہر کیا جا چکا ہے، بہرحال اس انتخاب سے یہ بات اور بھی مستحکم ہو گئی کہ غالب کے بہترین اشعار کا خاصا بڑا حصہ تیس برس کی عمر تک وجود میں آ چکا تھا، اس کے بعد اضافہ ہوا، مگر پچھلے اشعار پر صیقل کرنے اور ان کو اور آبدار بنانے پر بھی خاصی توجہ رہی۔ لیکن ایک مسئلہ اور ہے جس کی طرف جناب مالک رام کی نظر کسی وجہ سے نہیں گئی۔ غالب نے خود کہا ہے کہ پچیس سال کی عمر تک ایک دفتر جمع ہو گیا تھا، مگر نو دریافت دیوان غالب (نسخہ عرشی زادہ) اور نسخہ حمیدیہ کے کلام کو شاید دفتر نہ کہا جائے، پھر باقی کلام کیا ہوا؟ دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ غالب نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ میرا کلام مشکل ہے اور اس کو سن کر 'جاہل' ملول ہوتے ہیں، جاہل کا لفظ بعد میں اخلاقاً بدل دیا گیا۔ اور سخن وران کامل جیسی خوبصورت ترکیب استعمال ہوئی، غالب نے کہا ہے کہ یہ دفتر یک قلم چاک کر دیا گیا، صرف نمونے کے کچھ شعر رہنے دئے گئے۔ اب غالب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "گل رعنا" میں مشکل اشعار بہت کم ہیں اور ان میں سے بیشتر خفیف سے تغیر کے ساتھ منتخب دیوان میں نظر آتے ہیں۔ غالب نے اپنے جگر پاروں کو اس طرح کیسے قربان کر دیا۔ نسخہ حمیدیہ اور نسخہ عرشی زادہ میں خاصی تعداد میں ایسے اشعار ہیں جو ان کی فکر کی بلندی اور فن کی گہرائی کو ظاہر کرتے ہیں۔ غالب کیسے ایسے سخت انتخاب پر آمادہ ہو گئے کہ انھوں نے چند اشعار کو چھوڑ کر اپنے بہت سے جگر پاروں کی قربانی گوارا کر لی، یہاں یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ شاعر لازمی طور پر اپنے کلام کا بہترین پارکھ نہیں ہوتا۔ میر نے اپنا جو انتخاب نکات الشعرا میں دیا ہے اس سے میر حسن کا انتخاب بہتر ہے۔ پھر غالب نے آخر عمر میں نواب رام پور کے لئے جو انتخاب کیا اس میں سہل ممتنع پر زیادہ توجہ ہے شعر کی معنویت اور بلندی پر کم۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ غالب یوں تو اپنے اشعار کو اس طرح سنوارتے اور نکھارتے تھے جس طرح گائے اپنے بچے کو چاٹ کر صاف کرتی ہے مگر دوستوں کے لئے انتخاب کرتے وقت وہ اُن کے مذاق کے لحاظ سے یا وقتی حالات کے مطابق انتخاب کرتے تھے۔ بہرحال یہ بات مجھے تو کھٹکتی ہے کہ گل رعنا میں نسخہ حمیدیہ یا نسخہ عرشی زادہ کے بہت سے اچھے اشعار کیوں نہیں ہیں۔ یہ بھی غور طلب بات ہے کہ غالب نے تیس سال کی عمر تک فارسی میں کم کہا، اردو میں زیادہ مگر نہ صرف لوگ انھیں فارسی کا شاعر سمجھتے رہے وہ خود بھی اسی زلف کے اسیر رہے۔

دوسری بات جو خاصی پر اسرار معلوم ہوتی ہے یہ

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید تصدق حسین ایم نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) سے شائع کیا

F E G D.No. L.922 فون نمبر ۲۹ R.No. 2186/57